وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ (الحدیث)

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی

حقیقت

مضمون نگار:

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ الفرقان لکھنو

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا ذریعہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے بھیجے ہوئے
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی والی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

ادارۂ الفرقان

مسئول: محمد منظور نعمانی
مرتب: عتیق الرحمٰن سنبھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھنوی

پیدائش: ۱۶؍دسمبر ۱۹۰۵ء ...... وفات: ۴؍مئی ۱۹۹۷ء

آپ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ فراغت کے بعد تدریس بھی کی۔ نامور اور شہرہ آفاق متکلم بھی تھے۔ کئی قابل قدر کتابوں کے مصنف تھے۔ الفرقان لکھنؤ کے بانی اور مدیر تھے۔ حیات النبی ﷺ کے عنوان پر مولانا نور محمد تونسوی کتاب میں آپ کے رسالہ ''مسئلہ حیات النبی ﷺ کی حقیقت'' کا ذکر اور اقتباسات ملے، تلاش کرنے پر اس نام کا رسالہ تو نہ ملا۔ البتہ آپ کا ایک مضمون ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بابت ماہ ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء میں ملا۔ مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ کے نقل کردہ اقتباسات اس مضمون کے ساتھ ملائے تو یقین ہوا کہ یہی مضمون ''مسئلہ حیات النبی ﷺ'' رسالہ کی شکل میں ''مسئلہ حیات النبی ﷺ کی حقیقت'' کے نام سے شائع ہوا۔ جسے ہم اس مجموعہ میں اس نام سے شائع کر رہے ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اب سے ایک سال پہلے (۱۹۵۷ء) میں پاکستان گیا تھا، اس وقت وہاں مختلف صحبتوں سے یہ بات سننے میں آئی تھی کہ دیوبند کے علمی اور دینی سلسلہ سے تلمذ اور عقیدت کی نسبت رکھنے والے یہاں کے حضرات علماء میں ایک نیا اختلاف مسئلہ حیات النبی ﷺ کے بارہ میں پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن جن لوگوں سے میں نے اس بارے میں وہاں کچھ سنا وہ یا تو اصل حقیقت سے واقف نہ تھے یا اپنے علم وفہم کی خاص سطح کی وجہ سے نقطہ اختلاف کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے نہ تھے۔ اس لئے ان کے بیانوں سے میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس اختلاف کی اصل حقیقت کیا ہے اور جن حضرات اہل علم کا اس نزاع کے فریق کے طور پر نام لیا جاتا تھا۔ اتفاق سے ان میں سے کسی سے بھی اس سفر میں ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے اپنے ان بزرگوں اور دوستوں سے حسن ظن کی بنا پر میرا یہی خیال رہا کہ یہ اختلاف غالباً نزاع لفظی کے قبیل سے ہوگا۔

پھر پاکستان سے میری واپسی کے بعد مختلف اوقات میں اس سلسلہ میں میرے پاس کچھ خطوط بھی آتے رہے اور ان سے معلوم ہوتا رہا کہ یہ کش مکش برابر بڑھ رہی ہے اور ایک نئے تفرقہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

اس سلسلے کے بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی کتاب ''آب حیات'' کا حوالہ دے کر جماعت دیوبند کا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر موت طبعی وارد ہی نہیں ہوئی بلکہ آپ جس حیات کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز تھے۔ اسی حیات کے ساتھ قبر مبارک میں منتقل کر دیئے گئے۔ ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی تھا کہ بعض دوسرے اہل علم اس مسئلہ کی وجہ سے علماء دیوبند پر سخت طعن وتشنیع کر رہے ہیں اور مجھ سے اصرار کیا گیا تھا کہ اس بارہ میں جو کچھ میں صحیح سمجھتا ہوں اس کو ''الفرقان'' میں لکھوں۔ پھر گزشتہ مہینے (اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی پاکستان سے تشریف لائے تو انہوں نے بھی بتلایا کہ یہ اختلاف ونزاع وہاں ایک اچھا خاصہ فتنہ بنتا جارہا ہے اور اس کے اور بڑھنے کا خطرہ ہے اور اسی بنا پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا بلکہ اصرار سے فرمایا کہ اس بارہ میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔ الغرض یہی باتیں ان سطور کے لکھنے کی محرک ہوئی ہیں۔

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کی حیثیت ہرگز کسی فیصلے اور محاکے کی نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعہ میں اصل نقطہ اختلاف کیا ہے۔ بہرحال جو کچھ اس مسئلے میں میں سمجھے ہوئے ہوں اور جو کچھ میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں عرض کرتا ہوں۔ پہلے چند مسلمہ دینی اور دینی اور تاریخی حقیقتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں:

۱...... سب جانتے اور مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تریسٹھ سال (۴۰ سال نبوت سے پہلے اور ۲۳ سال نبوت کے بعد) اس عالم ناسوت میں قیام فرما کر ہجرت سے ٹھیک دس سال بعد ربیع الاوّل کے مہینے میں ''کل من علیها فان'' اور ''کل نفس ذائقة الموت'' کے عام قانون کے مطابق داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم)

۲...... بہت سے صحابہ کرام پر اس صدمہ کا ایسا اثر پڑا کہ ہوش وحواس بجا نہ رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال تو اس وقت یہ ہو گیا کہ قسم کھا کھا کر رسول اللہ ﷺ کی وفات سے انکار کرتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ اس وقت اس معاملے میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کہتے تھے کہ جو کوئی کہے گا کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی میں تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔

۳...... جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی قیام گاہ سخ سے تشریف لائے (جہاں حضور ﷺ کی اجازت سے وہ کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے) اور آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں تو اپنے آپ کو سنبھال کے

اور سب لوگوں کو جمع کر کے مسجد نبوی میں خطبہ دیا جس میں پوری صدیقی شان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا واشگاف اعلان کرتے ہوئے آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''من کان منکم یعبد محمداً فان محمداً قد مات و من کان منکم یعبد اللہ فان اللہ حیٌ لا یموت'' تم میں سے جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تو رحلت کر گئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو بیشک اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی: ''وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علٰی اعقابکم و من ینقلب علٰی عقبیه فلن یضر اللہ شیئا و سیجز اللہ الشاکرین'' اور محمد تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور شکر کرنے والے بندوں کو اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دے گا۔ (آل عمران: ۱۴۴)

اور بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس موقعہ پر حضور ﷺ کی وفات سے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں بھی تلاوت فرمائیں۔ بہرحال آپ کے اس خطبہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مسئلہ میں یکسو ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اگلے دن مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔

۴...... پھر رسول اللہ ﷺ کے وصال ہی کی بنیاد پر خلافت، امامت کا مسئلہ اٹھا اور آخر کار سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا گیا اور بیعت ہوئی۔

۵...... پھر رسول اللہ ﷺ کو آپ کے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا۔ پھر کفن پہنایا گیا۔

۶...... پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک خاص طریقہ اور ترتیب سے آپ کی نماز جنازہ پڑھی۔ یعنی اس طرح کہ چند چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (بعض روایات کے مطابق دس دس) کی جماعتیں حجرہ مبارک میں داخل ہوتی تھیں اور بغیر کسی کو امام بنائے نماز جنازہ پڑھ کر باہر آ جاتی تھی۔ اسی طرح تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی (اور ابن سعد وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کسی کو امام نہ بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اللہ ﷺ جیسے زندگی میں امام تھے اسی طرح بعد وفات بھی امام ہیں: ''هو امامنا حیا و میتا'' بہرحال یہ مسلم ہے کہ آپ کی نماز جنازہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بغیر کسی امام کے پڑھی۔

۷...... آپ کا وصال دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ہوا تھا۔ اس دن اس کے بعد کی رات اور سہ شنبہ کا پورا دن جنازہ اسی طرح حجرہ شریف میں رکھا رہا اور لوگوں کی ٹولیاں باری باری نماز جنازہ ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شب چہار شنبہ میں آپ کو اسی حجرہ مقدسہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ سب وہ مسلم دینی اور تاریخی حقائق و واقعات ہیں جو حدیث و سیر کی کتابوں میں عام طور سے مذکور ہیں۔ اسی لئے میں نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی بات سے بھی کسی صحیح العقیدہ صاحب علم کو انکار یا اختلاف نہ ہوگا۔

۸...... اسی طرح کسی صاحب علم پر یہ بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید میں ان بندگان خدا کو جو راہ حق میں قتل کئے گئے اور دشمنان حق نے بظاہر جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا ''احیاء'' یعنی زندہ کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ''وہ اپنے رب کے پاس شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو وہاں انواع و اقسام کا رزق اور طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں۔

۹...... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بہر حال ان سے افضل ہیں اور بدرجہا افضل ہیں۔ یقیناً ان کا انجام اور مقام ان شہداء کرام سے خوشتر اور بلند ہی ہونا چاہئے اور اسی لئے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کی حیات شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور اقویٰ ہی ہونی چاہئے[1]

۱۰...... اور نص قرآنی کے اسی اشارہ اور اسی اقتضاء کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے جو کتب حدیث میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارہ میں روایت کی گئی ہیں۔ جہاں تک اس ناچیز کو علم ہے ان حدیثوں کو سب سے پہلے امام بیہقی نے ایک مستقل رسالے میں جمع کیا ہے۔ پھر اس رسالے کے قریب قریب پورے مواد کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے جلیل القدر محدث وفقیہ شیخ تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب ''شفاء السقام'' میں نقل کر دیا ہے اور متاخرین حفاظ حدیث میں سے علامہ سیوطی نے بھی اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق حسب عادت ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں بھی یہ حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ان سب احادیث اور روایات سے مجموعی طور پر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس دنیا سے جانے کے بعد شہداء کو ایک خاص طرح کی حیات حاصل ہو جاتی ہے جس میں وہ دوسرے مومنین سے ممتاز ہیں اور جس کی بنا پر قرآن مجید میں ان کو احیاء کہا گیا ہے۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص الخاص حیات اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اور خاص کر خاتم الانبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے[2]

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا (جس سے غالباً کسی صاحب علم کو بھی اختلاف نہ ہوگا) اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

---

[1] حافظ ابن القیم نے کتاب الروح میں قرطبی کے حوالہ سے ان کے شیخ احمد بن عمرو کا ایک قول نقل کیا ہے جس کی ۲، ۳ سطریں یہ ہیں: ''ان الشهداء بعد قتلهم و موتهم احياء عند ربهم يرزقون فرحين، مستبشرين وهذه صفة الاحياء في الدنيا و اذا كان هذا في الشهداء و كان الانبياء بذالك احق و اولى''

[2] علامہ ابن القیم نے قرطبی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے شیخ احمد بن عمرو حیات انبیاء کے سلسلہ میں ان حدیثوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ ''يحصل من جملته القطع بان موت الانبياء انما هو ارجع الى ان غيبوا عنا بحيث لا ندركهم'' (کتاب الروح ص ۵۴)

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ مسئلہ میں اس طرح خیال کرنے والوں میں صرف زرقانی، ابن حجر ہیثمی، سیوطی اور شیخ عبدالحق دہلوی جیسے حضرات ہی نہیں ہیں بلکہ اس فہرست میں ان سے بہت پہلے ابو عبداللہ قرطبی اور شیخ احمد بن عمرو کے نام بھی اس فہرست میں ہیں۔ لیکن ان حضرات کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب قرار دینا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور ان کو اپنی قبروں میں بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات حاصل ہے۔ ایسا سمجھنے والوں کی خوش فہمی کے علاوہ ان بزرگوں پر تہمت بھی ہے۔ اسی طرح ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں مثلاً ''التصدیقات'' میں انبیاء علیہم السلام کی قبر والی حیات کو جو ''حیٰوۃ دنیویۃ'' کہا گیا ہے تو اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے۔ یعنی مع الجسد ہے، صرف برزخی روحانی نہیں ہے جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔ ''التصدیقات'' کے اردو ترجمہ ہی میں غور کرنے سے یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان بزرگوں کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب بیان کرنا اور ان کا یہ مسلک بتانا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور قبروں میں وہ بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات کے ساتھ موجود ہیں۔ صریحاً ان پر یہ الزام لگانا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے قرآن و حدیث کے صریح نصوص و بینات اور اجماع صحابہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ میں نہیں یقین کرتا کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے ایسی لغویات کہی ہو۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم!

ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات ناسوتی کا جو سلسلہ پیدائش سے لے کر ۶۳ سال کی عمر شریف تک جاری رہا تھا۔ وہ تو وفات کے دن ختم ہو گیا اور ''کل نفس ذائقة الموت'' کے قانون عام کے مطابق آپ پر وہ کیفیت وارد ہوئی اور آپ اس منزل سے گزرے جس کی تعبیر موت کے لفظ کی جاتی ہے۔ آپ کی اس رحلت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے موت ہی کہا اور موت ہی سمجھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو (کسی وقتی غلط فہمی یا غلبہ حال کی وجہ سے) اس کے ماننے میں ابتداً جو تامل اور تردد تھا وہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے بعد ختم ہو گیا اور آخر الامر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہو گیا کہ آپ کی ناسوتی حیات کا خاتمہ ہو چکا اور آپ پر موت وارد ہو چکی اور قرآن حکیم کی بات ''انک میت و انهم میتون'' پوری ہو گئی اور پھر اسی بناء پر آپ کو آخری غسل دیا گیا، موت کے بعد والا لباس یعنی کفن پہنایا گیا، قبر میں دفن کیا گیا (حالانکہ اگر کسی آدمی میں ناسوتی حیات کا شائبہ بلکہ شبہ بھی ہو اور اس کی موت کا پورا یقین نہ ہو چکا ہو تو اس کو دفن کر دینا شدید ترین شقاوت اور قطعاً حرام ہے اور کسی پیغمبر کے ساتھ شقاوت وظلم کا یہ معاملہ کرنا تو صرف حرام ہی نہیں بلکہ سخت ترین اور خبیث ترین کفر ہے۔

اور دوسری بات مذکورہ بالا دینی اور تاریخی حقائق وواقعات سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی وفات کو بالکل دوسرے آدمیوں کی سی موت نہیں سمجھا بلکہ اس کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی۔ اسی لئے آپ کو آخری غسل پہنے ہوئے کپڑوں میں دیا گیا، کرتا تک جسم اطہر سے نہیں اتارا گیا۔ نماز جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی۔ بلکہ دوسرے طریقہ سے پڑھی گئی (بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نماز جنازہ کے بجائے صرف صلوٰۃ وسلام عرض کیا گیا اور آپ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے بس دعا کی گئی) اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے دفن کرنے کے بارہ میں تاخیر نہ کرنے کا شریعت کا جو عام تاکیدی حکم ہے اس کے بالکل برخلاف قریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد دفن کیا گیا اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا گیا اور کسی ایک صحابی نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کے عزیز مسکن یعنی حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس حجرہ ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کئے گئے۔

اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کا جو مصرف اور نظام تھا وہی بدستور قائم رکھا گیا اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے مسکونہ حجروں کو تازیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہ ﷺ کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے، حالانکہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بیوی کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں۔

ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام ومعاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے، بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا۔ اسی طرح بعض احادیث سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کو اپنے مدفنوں میں ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (جو اس عالم کے مناسب ہے اور بعض حیثیات سے دنیا والی ناسوتی[1] حیات سے بھی

[1] اس تحریر میں ''حیات ناسوتی'' سے ہر جگہ میری مراد وہ حیات ہے جس کے لوازم اور خصائص اس متغیر مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اور اسی کا سلسلہ ختم ہو جانے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست وہ استفادہ کوئی نہیں کر سکتا جو آپ کی اس ناسوتی حیات میں ہر شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کر سکتا ہے۔

اعلیٰ (واقویٰ ہے) غالباً اس سے بھی کسی صاحب علم کو اختلاف نہ ہوگا۔ ہاں! اس کے آگے موت وحیات کی نوعیت کی تعیین اور تفصیلات میں کچھ اختلاف ہوسکتا ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے اور ایسے اختلافات خود اہل سنت میں بلکہ اہل سنت کے ایک ایک حلقے میں بھی ہمیشہ رہے ہیں۔ ان کو اہمیت دینا اور ان باتوں کا باعث تفرقہ بننا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

اس کے بعد چند کلمات میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے رسالہ ''آب حیات'' کے مضمون کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں۔ جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تصنیفات اور مکاتیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی اکثر تحریریں اردو زبان میں ہونے کے باوجود مضامین کے لحاظ سے اتنی مشکل اور ادق ہیں کہ آج کل کے ہمارے اصحاب درس علماء میں بھی شاذ ونادر ہی ایسے نکلیں گے جو ان کو پوری طرح سمجھ سکیں اور اس ناچیز کے خیال میں آپ کی تصنیفات میں سب سے مشکل اور دقیق ترین یہی آب حیات ہے۔ درس نظامی کے جملہ فنون میں سب سے مشکل منطق، فلسفہ اور کلام سمجھے جاتے اور ان فنون کی درسی کتابوں میں سب سے مشکل ہمارے درسی حلقوں میں قاضی، حمد اللہ، صدرا اور خیالی کو سمجھا جاتا ہے۔ اس عاجز نے یہ کتابیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں جو مشکل ترین ہیں وہ مدرسی کے زمانہ میں پڑھائی بھی ہیں۔ میں خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کتاب کے سمجھنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی جتنی کہ ''آب حیات'' کے سمجھنے میں پیش آئی تھی۔ میں نے آب حیات کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی عرفی طالب علمی کے آخری دور میں اس وقت کیا تھا جب کہ منطق وفلسفہ اور کلام کی سب درسی کتابیں میں پڑھ چکا تھا اور ان فنون کے وہ مباحث مجھے خوب مستحضر تھے جن کے استحضار کے بغیر آب حیات کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا احساس یہی تھا کہ میں نے ساری عمر میں جو کتابیں دیکھی یا پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشکل اور صعب الفہم یہی کتاب ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربہ کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے حلقہ کے علماء میں بھی آب حیات کو پوری طرح سمجھنے والے ہندو پاک کے طول وعرض میں اب گنتی کے چند ہی ہوں گے[1] اور بغیر کسی تکلیف اور انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ اب میں بھی ان میں سے نہیں ہوں۔ کیونکہ اس کے سمجھنے کے لئے منطق وفلسفہ اور کلام کے جو مباحث مستحضر ہونے چاہئیں وہ اب مجھے مستحضر نہیں ہیں۔ تاہم چونکہ ایک دفعہ اس کو سمجھ کر مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے اس کا حاصل ومدعا اور مرکزی مضمون الحمدللہ اب تک ذہن میں ہے۔

---

[1] مجھے اپنی اس رائے پر مزید اطمینان اپنے مکرم ومحترم مولانا قاری محمد طیب صاحب زید مجدہم سے ابھی حال میں یہ سن کر ہوا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمہ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے اخیر دور حیات میں ایک دن ان سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم کو آب حیات پڑھا دوں، لیکن مجھے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے تم اس کا ایک نسخہ لاکر میرے سرہانے رکھ دو۔ میں رات کا مطالعہ کرلیا کروں گا۔ قاری صاحب کا بیان ہے کہ میں نے نسخہ لاکر رکھ دیا۔ لیکن پھر یا تو مطالعہ کا وقت نہیں مل سکا یا کوئی اور وجہ پیش آگئی کہ اس پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آسکی۔ یہاں تک کہ حضرت مولانا مرحوم کا وقت موعود آگیا اور یہ کام رہ ہی گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آب حیات کس قسم کی کتاب ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب جیسے ذکی عالم وفاضل کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت تھی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم جیسے راسخ العلم اس کے پڑھانے کے لئے پہلے مطالعہ کرلینا ضروری سمجھتے تھے۔ پھر جب کل ۷/نومبر ۱۹۵۸ء کو اس ناچیز نے اپنی یہ تحریر سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کو سنائی تو دو واقعے حضرت ممدوح نے بھی اس کی تائید میں سنائے۔

ایک یہ کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا جب وصال ہوا تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھانی چھوڑ دیں۔ حالانکہ پہلے پڑھایا کرتے تھے۔ جب بہت اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں کو ہم صرف اس لئے پڑھایا کرتے تھے کہ حضرت کی باتیں سمجھنے میں ان سے مدد ملتی تھی۔ اب جب وہی نہیں رہے تو کیوں ہم خواہ مخواہ ان کتابوں پر مغز ماریں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر ان سطروں کے لکھنے سے پہلے بھی میں نے اس پوری کتاب کا ایک سرسری مطالعہ حال ہی میں کیا ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت یہ کہنے کا اپنے کو حقدار سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات وممات کے بارہ میں اس میں کوئی بات بھی جمہور امت اور اہل سنت کے ان تمام دینی اور تاریخی مسلمات اور معتقدات کے خلاف نہیں ہے۔ جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کی حیات اور حیات بعد الممات کی خاص نوعیت کی تحقیق اور تعیین میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنے خاص طرز پر ایک نہایت دقیق وعمیق کلام کیا ہے (اور اسی کے ساتھ دجال کی حیات وممات کی خاص نوعیت کے بارے میں بھی اسی طرز پر کچھ کلام کیا ہے) اور بلا شبہ یہ تحقیق اتنی دقیق ہے کہ عوام کے علاوہ اوساط کے فہم سے بھی بالاتر ہے۔ پس اس کو عوامی مسئلہ بنانا از قبیل اتباع متشابہات اور غریب عوام کو فتنے میں ڈالنا ہے، وہ بیچارے اصل حقیقت کو تو سمجھ نہ سکیں گے۔ پھر یا تو کچھ کا کچھ سمجھ کے اندھی عقیدت میں اسی کو اپنا عقیدہ بنا کے گمراہ ہوں گے یا حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر گمراہی اور بداعتقادی کے فتوے لگائیں گے۔ ہمارے علماء کرام کو للہ سوچنا چاہئے کہ اس سارے ضلال وفساد کا ذمہ دار عند اللہ کون ہوگا۔

دیوبندیت کیا ہے؟

آخر میں چند کلمات دیوبندی مسلک ومشرب کے بارہ میں بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر واساتذہ حضرات علماء دیوبند کا کوئی الگ اعتقادی یا فقہی مکتب فکر نہیں ہے۔ عقائد میں ہم اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر اور فقہ میں حنفی ہیں۔ البتہ احناف اہل سنت میں ہمارے اکابر کا ایک خاص رنگ ہے۔ بس اسی کی تعبیر دیوبندیت سے کی جاتی ہے اور وہ رنگ مندرجہ ذیل خصوصیات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔

۱...... فقہ حنفی پر اطمینان اور اس کے مطابق فتویٰ اور عمل کے ساتھ حدیث وسنت سے خاص تعلق وشغف، نیز دوسرے ائمہ مجتہدین اور اسی طرح حضرات محدثین کا ادب واحترام اور دل میں ان سب کی عظمت ومحبت۔

۲...... اس فقہی اور علمی خصوصیت کے ساتھ حضرات صوفیائے کرام کی نسبت کی طلب، تحصیل یا کم از کم دل میں ان کی عظمت ومحبت۔

۳...... اس سب کے ساتھ اتباع سنت اور شرک وبدعت سے نفرت اور اس معاملہ میں ایک خاص صلابت وحمیت۔

۴...... اور پھر اس سب کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور اس راہ میں مرمٹنے کا شوق، پس دیوبندیت دراصل اس خاص رنگ کا عنوان ہے جو ان عناصر اربعہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے اس سلسلہ کے اکابر واساطین مثلاً حضرت نانوتوی رحمہ اللہ وحضرت گنگوہی رحمہ اللہ (نور اللہ مرقدہم) اور ان کے خواص تلامذہ اور مسترشدین ان چیزوں کی جامعیت ہی میں ممتاز تھے۔ ورنہ یہ خصوصیات جدا جدا دوسرے حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

میں یہ بھی عرض کردوں کہ دیوبندیت کی یہ تحقیق اور اس کا یہ تجزیہ ایک صحبت میں اس عاجز نے مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ مرحوم سے سنا تھا۔ اس کے بعد سے جب اور جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس کو صحیح اور واقعہ کے مطابق پایا۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) دوسرا واقعہ اسی سلسلہ کا یہ سنایا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے تدریسی ادوار میں بار بار یہ طے ہوا اور اس کا منصوبہ بنا کہ حضرت کے خاص تلامذہ حضرت مدنی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ وغیرہ (جب کہ ان حضرات کے پڑھانے کا زمانہ تھا) حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تصانیف حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ لیکن اس کی نوبت غالباً نہیں آئی۔ بہر حال جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی مشکل تصانیف آب حیات وغیرہ خود نہیں دیکھی ہیں وہ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہیں اور اردو خواں عوام تو عوام آج کل علماء میں بھی کتنے ہیں جو ان کو سمجھ سکتے ہیں۔

بہرحال طریق اہل سنت اور فقہ حنفی سے وابستگی کے بعد یہ ہے وہ خاص رنگ یا خاص مشرب، جس کا عنوان دیوبندیت ہے۔ پس جو ہم میں سے جتنا اس رنگ میں کامل یا ناقص ہے اتنا ہی وہ دیوبندیت میں کامل یا ناقص ہے۔

اور سب سے پہلے میں اقرار و اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے حال اور عمل کے لحاظ سے بہت ہی ناقص قسم کا دیوبندی ہوں۔ لیکن الحمدللہ میں نے اصل دیوبندیوں کو دیکھا ہے اور ان کے طریقہ اور ان کے حال پر جینے اور مرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔

احب الصالحین ولست منهم لعل الله یرزقنی صلاحاً

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ بخدا نہ مجھے اب تک کسی ذریعہ سے معلوم ہو سکا ہے اور نہ میں خود غور کر کے سمجھ سکا ہوں کہ اس مسئلہ میں ہمارے علماء میں اصل نقطۂ اختلاف کیا ہے۔ میں خود جس طرح اس مسئلہ کو سمجھے ہوئے ہوں اور جو میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں نے ان صفحات میں اپنے امکان کی حد تک صاف اور منقح طور سے پیش کر دینے کی کوشش کی ہے؟ یہ ناچیز دو تین دن سے مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں سہارنپور آیا ہوا ہے۔ اپنی اس تحریر کی تکمیل بھی یہیں کی ہے اور حضرت ممدوح اور مخدومی حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث مظاہر علوم کو یہ تحریر میں نے لفظ بہ لفظ سنا بھی دی ہے اور میرے اور پوری جماعت کے ان دونوں بزرگوں نے اس کی تصویب بھی فرمائی ہے۔

ہمارے جن بزرگوں اور دوستوں کی رائے میں اس بارہ میں کوئی اختلاف پیدا ہو گیا ہے پورے ادب واحترام اور اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ جو کچھ ناچیز نے اس تحریر میں عرض کیا ہے اگر وہ صرف اتنے پر متفق ہوں تو یہ اختلاف ختم ہو جانا چاہئے اور اس سے آگے کے کسی نکتہ میں اگر بالفرض اختلاف ہو بھی تو اس کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہئے۔ بلکہ اعلان ہو جانا چاہئے کہ یہ اختلاف اس قسم کا علمی اختلاف ہے جو ایک حلقہ کے اہل علم میں بھی ہو سکتا ہے، خود ہمارے اساتذہ اور مشائخ میں بعض مسائل کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے اور رہا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو یہ عاجز اس کی بیسیوں مثالیں گنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم غیر ضروری بنیادوں پر تفریق کا باعث نہ بنیں۔ یہ تحریر مکمل کر لینے کے بعد میں دیوبند بھی حاضر ہوا اور وہاں استاذی حضرت مولانا ابراہیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کو بھی میں نے یہ تحریر سنائی۔ حضرت ممدوح نے آب حیات کے مضمون پر بڑی بصیرت افروز روشنی ڈالی جو بلاشبہ آپ ہی کا حق ہے۔ (لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ صرف خواص اہل علم کے سننے اور سمجھنے والی بات ہے۔ اس لئے میں اس کو اس تحریر کا جز بنانا نہیں چاہتا) اور ساتھ ہی مجھ سے فرمایا کہ اس تحریر کے آخر میں یہ اضافہ اور کر دو کہ آب حیات کے مضمون کو جو شخص ٹھیک ٹھیک سمجھ لے گا وہ اس کے نصوص قرآن و حدیث یا اجماع امت کے خلاف ہونے کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ یہ شبہ اسی کو ہوگا جو اس کا مطلب صحیح سمجھ نہ سکے گا اور جو شخص اس کا مطلب ایسا بیان کرے جو نصوص اور اجماع کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اس کا مطلب صحیح نہیں سمجھا۔ (اسی کے ساتھ مولانا ممدوح نے فرمایا کہ) آبحیات والی تحقیق لیک نہایت دقیق علمی تحقیق اور ایک عمیق علم ہے۔ اس کا سمجھنا یا ماننا نہ اہل سنت ہونے کی شرط ہے نہ دیوبندی المشرب ہونے کی۔ لہٰذا اس مسئلہ کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہئے۔ دونوں فریق ہمارے ہیں اور ہماری جماعت کے افراد ہیں۔ (دارالعلوم دیوبند ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء)

(ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، ماہ ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء ص ۲۷ تا ۳۸ و ۵۳)